خالد محمود سنجرانی *

واجد علی شاہ کی ایک کمیاب مثنوی: دریاے تعشّق

واجد علی شاہ کی مثنوی دریاے تعشق کا زیرِ نظر ایڈیشن مارچ ۱۸۸۵ء میں نول کشور کان پور سے شائع ہوا۔ اس میں ''تاریخ طبع سابق لراقمہٗ'' کے عنوان سے فدا علی عیش کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ موجود ہے، جس کی رو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اسی مطبع سے ۱۲۸۸ھ میں بھی شائع ہوچکی تھی۔ قطعہ کا آخری شعر، جس سے طبعِ سابق کی تاریخ نکلتی ہے، ذیل میں درج ہے:

کیا ملا ہے گوہر تاریخ طبع
خوب و زیبا مثنوی چھاپی ہے واہ
(۱۲۸۸ھ)[۱]

زیرِ نظر ایڈیشن کے کل صفحات کی تعداد ۶۴ ہے۔ ہر ورق پر چار کالم بنائے گئے ہیں اور ان کالموں میں کتابت کا انداز باریک ہے۔ ایک ورق پر چار کالموں اور کتابت کے باریک انداز کے سبب پوری مثنوی چونسٹھ صفحات میں سما گئی ہے۔ کم وبیش ہر صفحے پر پچاس کے لگ بھگ اشعار موجود ہیں۔ مثنوی کا آغاز اس حمدیہ شعر سے ہوتا ہے:

کرتا ہوں میں حمد اس خدا کی
جس نے ہستی کی یہ بنا کی[۲]

مثنوی کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے:

تابندہ رہے یہ نجم شاہی
قبضے میں ہو مہ سے تابماہی[۳]

اس آخری شعر کے بعد ''خاتمہ طبع سابق'' کے عنوان سے واجد علی شاہ کی شان میں نثری قصیدہ نما تحریر سامنے آتی ہے جو ڈیڑھ صفحے کو محیط ہے۔ اس کے بعد فدا علی عیش کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ درج ہے۔ اس نسخے کا اختتام اس سطر پر ہوتا ہے:

> الحمد للہ والمنہ کہ کتاب لاجواب مسمیٰ بہ دریاے تعشق بماہ مارچ ۱۸۸۵ء مطبع منشی نول کشور واقع کان پور میں طبع ہوئی۔[۴]

اس مثنوی کا زیرِ نظر ایڈیشن واجد علی شاہ کی زندگی ہی میں شائع ہوا اور گمانِ غالب ہے کہ ان کی زندگی میں شائع ہونے والا یہ آخری ایڈیشن ہے۔ دریاے تعشق کے اس ایڈیشن سے قبل اس مثنوی کی تین اشاعتوں کے حوالے موجود ہیں۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنے کتب خانے میں اس مثنوی کے اولین ایڈیشن کی موجودگی کی نشان دہی کی ہے:

> اس مثنوی کا جو نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے اس میں ابتدائی دس صفحے غائب ہیں۔ اس لیے مطبع کا نام موجود نہیں ہے۔ لیکن کاغذ کی نوعیت اور چھپائی کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب شاہی مطبع کی چھپی ہوئی ہے۔[۵]

سید مسعود حسن رضوی ادیب نے اس مثنوی کے دوسرے ایڈیشن کی نشان دہی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسے مطبع سلطانی لکھنؤ سے شائع کیا گیا تھا اور یہ نسخہ ۲۳۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ ان کے بقول اس دوسرے ایڈیشن میں واجد علی شاہ نے خاصی تبدیلیاں کی تھیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے ان تبدیلیوں کی وجہ سے دوسرے ایڈیشن کو ایک نئی مثنوی سے تعبیر کیا:

> دریاے تعشق کے دونوں ایڈیشنوں کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں اس قدر لفظی تبدیلیاں کی گئی ہیں کہ وہ گویا ایک دوسری مثنوی بن گئی ہے۔[۶]

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس مثنوی کے اولین دونوں ایڈیشن شاہی مطبع سے شائع ہوئے۔

شاہی مطبع کے ان دونوں ایڈیشنوں کے بعد اس مثنوی کے جس ایڈیشن کی طرف سید مسعود حسن رضوی ادیب نے اشارہ کیا، وہ نول کشور، کان پور سے مارچ ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا تھا اور یہی ایڈیشن ہائیڈل برگ یونی ورسٹی، جرمنی میں موجود ہے اور ہمارے پیشِ نظر ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے نول کشور سے شائع ہونے والے ایڈیشن کے قطعۂ تاریخ سے معلوم کیا کہ اس مثنوی کا ایک ایڈیشن اسی مطبع سے ۱۲۸۸ھ میں شائع ہو چکا تھا لیکن انھوں نے ۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۱ء کے ایڈیشن کے باب میں کوئی معلومات درج نہیں کیں جس سے قیاس کہتا ہے کہ ان کی نظر سے ۱۲۸۸ھ کا ایڈیشن نہیں گذرا۔ ان کے پاس شاہی مطبع کے اولین دونوں ایڈیشن موجود تھے جن کی بنیاد پر انھوں نے اس مثنوی کا تعارف کروایا جب کہ انھیں نول کشور کے ایڈیشن کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے تھی کہ نول کشور کے اس ایڈیشن کی اشاعت کے وقت واجد علی شاہ نہ صرف حیات تھے بلکہ مثنوی میں ترامیم بھی کر چکے تھے۔ چونکہ ہمارے سامنے شاہی مطبع کے دونوں ایڈیشن موجود نہیں، اس لیے ہم اس مثنوی کے تمام متن کا موازنہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے مسعود حسن رضوی ادیب کے درج کردہ وہ اشعار ہیں، جو انھوں نے اس مثنوی کے تعارف کے باب میں درج کیے۔ ان کے درج کردہ اشعار اس مثنوی کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن سے ماخوذ ہیں۔ ہم ان دونوں ایڈیشنوں سے ماخوذ اشعار کا موازنہ نول کشور، کان پور کے ایڈیشن سے کرتے ہیں۔ اس مثنوی کے پہلے ایڈیشن میں ''سببِ تالیف'' کے سلسلے میں واجد علی شاہ کے اشعار کو مسعود حسن رضوی ادیب نے درج کیا ہے جو ذیل میں پیشِ خدمت ہیں:

درپے ہوئے میرے لوگ اک روز
اک مثنوی اور کہہ دو دل سوز
کہنے لگا مثنوی کو میں بھی
اکیسویں روز ہوئی تمامی
دریائے تعشق اس کا ہے نام
ہے شکر خدا ہوا سر انجام[7]

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ مصنف کے درپے ہوئے اور ان کے اصرار پر اس مثنوی کو تحریر کیا گیا۔ وہ لوگ کون تھے اور واجد علی شاہ کی زندگی میں کس حد تک اثر پذیری رکھتے تھے،

اس کا ذکر مثنوی میں نہیں ملتا۔ دوسرے ایڈیشن میں ''سبب تالیف'' میں قدرے ترمیم کی گئی۔ شاعر کی طرف سے بتایا گیا کہ اسے ایک 'ماہ پیکر' کے اصرار پر لکھا گیا ہے۔ زیرِ نظر ایڈیشن میں ''سبب تالیف'' میں اس باب کی صراحت کی گئی ہے اور سبب بھی دو انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ذیل میں زیرِ نظر ایڈیشن کے ''سببِ تالیف'' سے کچھ متعلقہ اشعار درج ہیں:

کچھ شعر و سخن کا مشغلہ تھا
دل میں بھی عجیب ولولہ تھا
اس وقت بلائیں میری لے کر
کہنے لگی ایک ماہ پیکر
اک مثنوی ہم کو اور کہہ دو
دنیا میں نہیں ہے تم سا خوشگو[۸]

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی واجد علی شاہ نے 'ایک ماہ پیکر' کی فرمائش پر کہی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ گذشتہ مثنوی بھی اسی 'ماہ پیکر' کے اصرار پر لکھی گئی۔ زیرِ نظر ایڈیشن میں ''سبب تالیف'' شاہی مطبع کے پہلے ایڈیشن سے خاصا مختلف ہے۔ پہلے ایڈیشن میں کچھ لوگوں کے کہنے پر مثنوی لکھنے کو سبب بتایا گیا جب کہ زیرِ نظر ایڈیشن میں اس کا سبب تالیف ایک ماہ پیکر کو بتایا جا رہا ہے اور یہ بھی اشارہ موجود ہے کہ اس سے پہلے جو مثنوی تحریر کی گئی، اس کی تالیف کا سبب بھی یہی ماہ پیکر ہے۔ زیرِ نظر ایڈیشن میں ''سبب تالیف'' کے حصے میں ایک اور اشارہ بھی موجود ہے جو ذیل کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے:

لو جودت طبع اب دکھاؤ
مشتاق ہیں داستاں سناؤ
بیٹھے ہو عبث ملول و محزون
کچھ کھیلو شکار مرغ مضمون
اک روز تھے جمع کچھ پری زاد
بندِ غم و رنج سے تھے آزاد

تھا نشۂ بادۂ جوانی
حاصل تھا سرور زندگانی
اچھے میرے پیارے جان عالم
قربان تمھارے جان عالم
اس طرز بیاں پہ پستے ہیں ہم
اس پیاری زباں پہ پستے ہیں ہم[9]

''سبب تالیف'' کے علاوہ اختلافِ متن کی کچھ اور صورتیں بھی سامنے آئی ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں کہ واجد علی شاہ نے اس زمانے میں یہ مثنوی کہی تھی کہ جب ان کے دادا شاہ زماں محمد علی شاہ اودھ کے بادشاہ تھے اور والد ثریا جاہ امجد علی شاہ ان کے ولی عہد تھے۔ اس کا تذکرہ پہلے ایڈیشن میں ان اشعار کی صورت میں موجود ہے:

فرزند ثریا جاہ کا ہوں
تارا تو میں ایسے ماہ کا ہوں
ہے شاہ زماں اودھ کا جو شاہ
قبضے میں ہے تا بہ ماہی و ماہ
فرزند کا اس کے ہوں میں فرزند
اس شہ کے جگر کا ہوں میں دل بند[10]

نول کشور کے اس زیرِ نظر ایڈیشن میں درج بالا اشعار موجود نہیں کیونکہ اس ایڈیشن کی اشاعت کے وقت واجد علی شاہ خود حاکمِ اودھ تھے۔ نول کشور کے اس ایڈیشن میں ''سبب تالیف'' کے عنوان سے جو اشعار موجود ہیں، ان میں وہ اپنے والد کے اس دنیا سے اٹھ جانے کو یاد کرتے نظر آتے ہیں:

کیا کیا کیجے فلک کا شکوا
کچھ دردِ جگر بھی سنیے میرا
تھا اسمِ مبارک ان کا اے آہ
شاہ امجد علی فلک جاہ

تعلیم کا ان کے ہے یہ سب فیض
ہوتا ہے کس سے ایسا کب فیض
مجھ کو بھی بہ دل تھی ان سے الفت
حد سے بھی سوا تھی کچھ محبت
لیکن یہ گلہ ہے آسماں سے
کیا جلد اٹھا لیا جہاں سے
اس درجہ ملال کر نہ اے دل
رنج بے فائدہ سے حاصل[11]

''سببِ تالیف'' کے ان چند اشعار میں اختلافِ متن کی یہ صورت ظاہر کرتی ہے کہ نول کشور سے اشاعت سے قبل واجد علی شاہ نے اس مثنوی پر نظرِ ثانی کی اور متن میں ترامیم کیں۔ ہمارا گمان کہتا ہے یہ ترامیم خاصی حد تک کی گئی ہوں گی۔ چونکہ ہمارے سامنے اس مثنوی کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کا صرف وہ متن موجود ہے جو مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنے مضمون میں درج کیا، اسی پر انحصار کرتے ہوئے اختلافِ متن کی یہ مثالیں پیش کی گئیں۔ علاوہ ازیں، نول کشور سے اس ایڈیشن کے آخری صفحات پر واجد علی شاہ نے اپنی حکومت کی تابندگی اور قائم رہنے کی دعا کی ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ اشعار پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں نہیں ہوں گے کیونکہ تب وہ حاکمِ اودھ نہ تھے بلکہ ان کے دادا تھے۔ نول کشور کے ایڈیشن سے آخری اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

تو نے ہی کیا ہے مجھ کو سلطاں
عالم ہے مرا مطیع فرماں
کیا شکر تیرا ادا ہو ہم سے
امید ہے یہ ترے کرم سے
ہر دم مجھے بامراد رکھنا
دل کو مرے شاد شاد رکھنا
تابندہ رہے یہ نجم شاہی
قبضے میں ہو مہ سے تا بہ ماہی[12]

علاوہ ازیں، اس مثنوی کی ابتدا اور اختتام میں بھی خاصی تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب نے ان اشعار کو مثنوی کا خاتمہ قرار دیا ہے:

اب روکو عنانِ خامہ اختر
ہم جانتے ہیں کہ ہو سخن ور
دکھلا چکے طبع کی روانی
لو ختم کرو کہیں کہانی
اس نظم کی منصفوں سے لو داد
غالب ہے کہ سن کے ہو ہر اک شاد
کس نور کی نظم ہے تمھاری
گوہر سے سوا ہے آب داری
امید ہے جب کہ پڑھی جائے
ہر سو سے صدائے آفریں آئے[۱۳]

نول کشور کے اس ایڈیشن میں یہ تمام تر اشعار اس ترتیب سے موجود نہیں اور نہ ہی یہ اشعار اس مثنوی کا خاتمہ ہیں۔ نول کشور سے طبع ہونے والی مثنوی کے آخری اشعار حوالہ نمبر۱۲ کے تحت درج کیے جا چکے ہیں جو مسعود حسن رضوی ادیب کے درج کردہ اشعار سے یکسر مختلف ہیں۔ متن کی یہ چند داخلی شہادتیں اس بات کو تقویت دیتی ہیں کہ اشاعتِ نو سے پہلے مثنوی پر نظرِ ثانی کی گئی، سببِ تالیف تبدیل کیا گیا، شاہ زمان کی بادشاہت اور امجد علی شاہ کی ولی عہدی کا تذکرہ حذف کر دیا گیا۔ ان چند مثالوں سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نول کشور پریس کو اشاعت کے لیے دینے سے قبل اس مثنوی کے متن میں خاصی ترامیم کی گئی ہوں گی۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب کی نظر اس مثنوی کے جس ایڈیشن پر پڑی، تدوینِ متن کے لیے اس نسخے پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ نول کشور کا یہ ایڈیشن واجد علی شاہ کی زندگی میں شائع ہوا اور گمانِ غالب ہے کہ نول کشور سے شائع ہونے والا یہ ایڈیشن ان کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری ایڈیشن ہے۔ ان کا سالِ وفات متعین کرتے ہوئے مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں:

> ۲۰ ستمبر ۱۸۸۷ء اور اور ۲ محرم ۱۳۰۵ھ کا دن گذار کر رات کو ۲ بجے بادشاہ نے انتقال کیا۔ اس المناک واقعے سے متاثر ہو کر شعرا نے صد ہا قطعاتِ تاریخ اپنی لیاقت کے

موافق تصنیف کیے ہیں۔[۱۴]

نول کشور سے اس مثنوی کا اولین ایڈیشن ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا تھا جو ان کی وفات سے سولہ سال قبل کی اشاعت ہے، نول کشور، کان پور سے اسی مثنوی کا دوسرا ایڈیشن مارچ ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا جو ان کی وفات سے کم وبیش دو سال قبل کی اشاعت ظاہر کرتا ہے۔ ہم پہلے بھی اس امر کی نشان دہی کر چکے ہیں کہ نول کشور کا یہ دوسرا ایڈیشن نول کشور کے پہلے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۲۸۸ھ) کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آخر میں ''خاتمہ طبع سابق'' اور ''تاریخ طبع سابق لراقمہ'' کے عنوانات سے فدا علی عیش کا قطعۂ تاریخ اور نثر میں اختتامی سطور درج ہیں۔

واجد علی شاہ کی خودنوشت داستانِ عشق پری خانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کا محرک ایک خاتون ہیں کہ جس کو انھوں نے اپنی دل بستگی کے لیے رکھ لیا تھا لیکن یہ بات ان کے محل کو خاصی ناگوار گذری، معاملہ طول پکڑ گیا، بات ان کے والد تک جا پہنچی تو واجد علی شاہ نے اس خاتون کو الگ کر دیا۔ اپنے حرم سے بھی نالاں ہو کر ان سے روابط قطع کر دیے۔ اپنے والد سے کیے گئے وعدے کو نبھایا اور عمر بھر اس خاتون کا نام نہ لیا۔ اس مثنوی کے متن سے ان معاملات کے اشارے ملتے ہیں لیکن اس خاتون کا نام سامنے نہیں آپاتا۔ ان کی تصنیف پری خانہ سے یہ عقدہ وا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں واجد علی شاہ کی ان مثنویوں کا محرک کون تھیں۔ اس خاتون کے ہجر میں لکھی جانے والی ان تین مثنویوں میں سے ایک یہی دریاے تعشق ہے۔ پری خانہ میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ میری عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی، اسی زمانے میں مجھے فنِ شعر کا شوق ہوا، اور اس عورت موتی خانم کی محبت میں غزلوں کے دو دیوان مرتب کیے اور تین مثنویاں موزوں کیں، لیکن اپنے دل کی بے چینی کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا، حقیقت یہ ہے کہ اس آتشِ غم میں اتنا جلا کہ مجھ میں جان نام کو رہ گئی تھی۔[۱۵]

پری خانہ میں واجد علی شاہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اب جب کہ وہ خود بادشاہ ہیں اور مختارِ کل کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس اختیار کو انھوں نے والد کو دی گئی زبان پر ترجیح نہیں دی۔ ان کے بقول انھوں نے اپنے والد سے کیے گئے وعدے کو نبھایا اور پھر موتی خانم کا نام تک نہیں لیا۔ موتی خانم کی

فرمائش پر تحریر کردہ اس مثنوی کی اہمیت یہ بھی ہے کہ بعد ازاں خود واجد علی شاہ نے اس کے ساتھ اپنی دو اور مثنویاں شامل کر کے انھیں ڈرامائی صورت بھی دی۔ مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں:

> واجد علی شاہ نے اپنی ان تین مثنویوں کے ڈرامے بنا کر لاکھوں روپے کے صرف سے ان کے کھیل تیار کیے تھے۔[16]

مسعود حسن رضوی ادیب نے برس ہا برس کی تلاش کے بعد ان مثنویوں کی بنیاد پر تیار کیے جانے والے کھیلوں کی تفصیل اپنی کتاب لکھنؤ کا شاہی اسٹیج میں پیش کی۔ مسعود حسن رضوی ادیب کی معلومات کے مطابق دریاے تعشق کے پلاٹ کو سامنے رکھ کر منشی محمد الف خاں حباب نے نیرنگ قاف معروف بہ غزالہ ماہ رو کے نام سے ایک ڈراما تیار کیا تھا کہ اسٹیج کرنے کے بعد مطبع گلزار محمدی لکھنؤ سے ۱۹۰۰ء میں شائع کیا گیا۔ علاوہ ازیں، اس مثنوی کی بنیاد پر سید نظیر حسن شفیق اکبر آبادی نے بھی ایک ڈراما تیار کیا تھا جو مسعود حسن رضوی ادیب کی معلومات کے مطابق ۱۸۹۲ء میں شائع بھی ہوا۔ ان دونوں کھیلوں سے اس مثنوی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس مثنوی کا آغاز حمد، نعت، منقبت اور سبب تالیف سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد داستان کا آغاز ساقی نامہ سے ہوتا ہے جو اس عہد میں منظوم داستانوں کا لازمہ تھا۔ اس مثنوی میں کئی ابواب کے عنوانات فارسی میں ہیں، جن سے اس عہد میں فارسی کی اثر پذیری کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ کم و بیش سبھی اردو مثنویوں میں ابواب کے عنوانات فارسی ہی میں درج کیے جاتے تھے۔ اردو داستانوں کا کیا مذکور، علاقائی زبانوں کے منظوم قصے بھی اسی روایت کے حامل ہیں، جس کی سب سے روشن مثال میاں محمد بخش کی سیف الملوك ہے۔ یہ منظوم داستان پنجابی ادب کی کلاسیکی روایت سے جڑی ہوئی ہے لیکن اس کے ابواب کے عنوانات فارسی زبان ہی میں ہیں۔

داستان کا آغاز بادشاہ کی بے اولادی کے غم سے ہوتا ہے۔ روایتی انداز میں قصہ آگے بڑھتا رہتا ہے کہ جس میں بادشاہ کی مایوسی، دنیا سے کنارہ کشی، وزیرِ با تدبیر کی تدابیر، پیروں فقیروں سے ملنا ملانا، منت مرادوں کا منظر نامہ وغیرہ سبھی کچھ اس مثنوی میں بھی شامل ہے۔ ایک مدت بعد بادشاہ کے ہاں بیٹی کی ولادت، وزیر کے ہاں بیٹے کا جنم لینا، تقریبات کا بیان، لکھنوی معاشرت کی عکاسی، پراسرار

دنیائیں، پریاں، جن، دیو اور ان کی بستیاں اپنی روایتی شان کے ساتھ اس مثنوی میں جلوہ گر ہیں۔ ایک چیز جو کھٹکتی ہے، وہ واقعات کا منطقی ترتیب میں نہ ہونا ہے۔ قصہ در قصہ اور ذیلی واقعات کی وجہ سے مثنوی میں کہانی پن خاصا کمزور دکھائی دیتا ہے۔

اس مثنوی کی اہمیت اس میں موجود نسائیت کے حوالوں سے بھی ہے۔ عموماً مثنویوں میں بے اولاد بادشاہ کے ہاں منتوں مرادوں سے بیٹا جنم لیتا ہے لیکن اس مثنوی میں بادشاہ کے ہاں بیٹی کی پیدائش کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ دیگر مثنویوں کے برعکس اس میں مرکزی کردار غزالہ کو عاشق کے روپ میں پیش کیا گیا ہے اور مرد کو محبوب کے کردار میں پیش کیا گیا ہے۔ واجد علی شاہ نے عین شباب میں اس مثنوی کو تحریر کیا تھا، عورت کو عاشق اور مرد کو محبوب کے روپ میں پیش کرنے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں جن میں سے ایک اہم وجہ خود شاعر کا محبوب کی زندگی بسر کرنا ہے کہ عموماً شاہی اندازِ حیات میں شاہی خاندان کے مرد محبوب کے رتبے پر ہی فائز نظر آنا چاہتے ہیں۔ اس انداز کے سبب مثنوی میں نسوانی کردار ہجر کی آگ میں تڑپتے ہوئے، وصل کے لیے بے تاب، اپنے محبوب کے لاڈ نخرے اٹھاتے ہوئے، دیگر نسوانی کرداروں کے حسن سے جلتے کڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مثنوی کے مکالموں میں عورتوں کی باہمی گفتگو لکھنؤ کا روز مرہ پیش کرتی ہے اور نسائی جھلک بھی دکھلاتی ہے:

آپس میں گلے لپٹ لپٹ کر
کہتی تھی ہر ایک ماہ پیکر
اللہ ری رنڈی بے مروت
کیا تجھ سے ہوئی ہے مجھ کو نفرت[۱۷]

اردو شاعری میں رقیب کا تصور قدیم بھی ہے اور مضبوط تر روایت بھی رکھتا ہے کہ جسے فیض ایسے جدید شاعر نے ایک نئے احساس سے بیان کیا۔ قدیم اردو شاعری سے لے کر جدید شعرا ے اردو تک رقیب کا تصور عموماً مرد ہی سے وابستہ رہا ہے۔ واجد علی شاہ کی اس مثنوی میں رقیب کا تصور نسائی ہے۔ چونکہ اس مثنوی میں چاہنے والے کا صیغہ مؤنث ہے، اسی مناسبت سے بیشتر تصورات بھی نسائی ہیں۔ اس مثنوی کا رقیب بھی مؤنث ہے اور ہجر کے ان خصائص کا آئینہ دار نہیں، جس میں ہجر کی آگ روح کو خاکستر کر دیتی ہے۔ اس مثنوی میں ہجر کے عالم کا ایک پہلو نہ صرف نسائی ہے بلکہ وجود کے

مظاہر کے ہجر و وصال کا نوحہ کناں دکھائی دیتا ہے:

مہرو سے ہے جس پری کی یاری
بد ذاتی اسی کی ہے یہ ساری
محروم رہی وصال سے میں
مرجاؤں گی اس ملال سے میں
لب بھی نہ ہوئے لبوں سے باہم
واللہ ہیں بے نصیب کیا ہم
کیا تفرقہ آسماں نے ڈالا
ارماں بھی نہ ہم نے کچھ نکالا[۱۸]

واجد علی شاہ کی عیش کوشی کا شہرہ رہا اور لکھنؤ کے تہذیبی خدوخال کے ابھرنے میں اور ان کے مزاج میں اس غالب رویے کو اہمیت دی گئی۔ تاہم اسی پری خانہ میں واجد علی شاہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے والد کے حکم کی تعمیل میں موتی خانم کو خود سے الگ کر لیا تھا۔ اپنے والد کی وفات اور تخت شاہی پر بیٹھنے کے بعد اپنی خود مختاری پر والد سے کیے جانے والے عہد کی پاسداری کو فوقیت دی اور کبھی موتی خانم کا نام تک نہ لیا۔ واجد علی شاہ کی زندگی کے باب میں اسی نوع کی غلط فہمی اور یک رخے اندازِ نظر کی بدولت رشید حسن خاں اور نیر مسعود میں مطبوعہ مکاتیب کا تبادلہ ہوا جسے دلی اور لکھنؤ کی روایتی چشمک بھی کہا جا سکتا ہے۔ رشید حسن خاں کے نزدیک لکھنؤ کی زندگی میں عیش کوشی کی ایک بڑی وجہ خود واجد علی شاہ کا عاشقانہ طرزِ حیات تھا جس کی پیروی کو ان کے امرا اور متعلقین نے ضروری جانا اور پھیلتے پھیلتے یہ روش معاشرے کا حصہ بنتی چلی گئی۔ اس کے برعکس نیر مسعود کا موقف واجد علی شاہ کی تصنیفی حیات کے بل بوتے پر سامنے آیا۔ دریاے تعشق کا متن اس اختلافی بحث کو بھی حل کرنے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے اور واجد علی شاہ کی زندگی میں غالب رجحانات اور رویوں کی بہت حد تک نشان دہی کر سکتا ہے۔ اس موضوع پر رشید حسن خاں اور نیر مسعود کے مابین مکاتیب کی اشاعت سے پرانی بحث نے پھر سے زور پکڑا۔ واجد علی شاہ کی تصانیف کی بنیاد پر ان کے تشخص کو بگاڑا بھی گیا۔ اس کا ایک طرح سے آغاز عبدالحلیم شرر کی گذشتہ لکھنؤ سے ہوا جس میں انھوں نے دوٹوک انداز میں

کہا:

> وہ کہاریوں، رنڈیوں، خواصوں، محل میں آنے جانے والی عورتوں غرض صد ہا عورتوں پر عاشق ہوئے اور چونکہ ولی عہد سلطنت تھے اپنے عشق میں خوب کامیاب ہوئے۔ جن کی شرمناک داستانیں ان کی نظموں، تحریروں اور تصنیفوں میں خود ان کی زبان سے سن لی جاسکتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ تاریخ میں ان کا کیریکٹر سب سے زیادہ ناپاک اور تاریک ہے۔[19]

واجد علی شاہ کے بارے میں عبد الحلیم شرر کے اس موقف کا سید مسعود حسن رضوی ادیب نے گہرائی میں جا کر جائزہ لیا اور واجد علی شاہ کی کردار کشی کو انگریز سرکار کی ایک سازش کے طور پر بھی دیکھا کہ اس نوع کے حربے فاتحین کی سرشت میں تب بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب نے واجد علی شاہ کے ہم عصر اور ہم شہر ممتاز شاعر سید علی کامل، راجا درگا پرشاد سندیلوی، ہندوستانی زبان کے مشہور فرانسیسی عالم گارساں دتاسی، کچھ عینی شاہدین اور خود واجد علی شاہ کی تصانیف سے متعدد حوالے نقل کرتے ہوئے واجد علی شاہ کے بارے میں اس تاثر کی نفی کی ہے جو شرر کی گذشتہ لکھنؤ سے ابھرتا ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں :

> واجد علی شاہ اور ان کی حکومت کو بدنام کر کے اودھ پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے ناپاک مقصد سے انگریزوں اوران ضمیر فروش ہندوستانی پٹھوؤں نے پروپیگنڈے کی وہ مہم چلائی کہ واجد علی شاہ کا نام عیش کوشی اورنفس پرستی کا مترادف بن گیا۔ کون تصور کر سکتا ہے کہ اس بدنام بادشاہ کو اپنی ہوس ناکیوں اور عشق بازیوں سے کتابیں لکھنے کی فرصت ملی ہوگی۔ پھر کتابیں بھی دو چار نہیں، دس بارہ نہیں، سو سے زیادہ! ......صرف میری تنہا تلاش کے نتیجے میں واجد علی شاہ کی ساٹھ سے اوپر کتابیں بیش تر شاہی مطبع کی چھپی ہوئی دستیاب ہوگئیں جو میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔[20]

سرشار، سید مسعود حسن رضوی ادیب، رشید حسن خاں، نیر مسعود وغیرہ نے واجد علی شاہ کی حمایت اور مخالفت میں جو کچھ بھی لکھا، اس کی مؤثر تائید یا تردید کا ایک حوالہ خود واجد علی شاہ کی تصانیف ہیں۔ واجد علی شاہ کی شاعری میں ان کی مثنویوں کو غزل اور مرثیے کی نسبت زیادہ اہمیت دی گئی کہ ان کا

فطری میلان اس صنف کی طرف زیادہ تھا۔ انھوں نے شاعری کا آغاز بھی مثنویوں سے کیا۔ کوکب قدر سجاد علی مرزا لکھتے ہیں:

> واجد علی شاہ دراصل غزل کے نہیں مثنوی کے شاعر ہیں ...... اسی سے ان کی شاعری کا آغاز اور اسی سے اختتام ہوا اور اس بیچ میں انھوں نے جو کچھ کہا، وہ کیا بلحاظِ تعداد اشعار اور کیا بلحاظِ خوبیِ کلام، ان کی مثنویوں سے کم رتبہ اور کم مایہ ہے۔ [۲۱]

ان کی تصانیف کے وہ ایڈیشن زیادہ قابلِ اعتماد اور وقیع ہیں، جو ان کی حیات ہی میں شائع ہوئے۔ ہائیڈل برگ یونی ورسٹی میں واجد علی شاہ کی مثنوی کا یہ ایڈیشن دیگر کئی حوالوں کے علاوہ اس باب میں بھی اہمیت کا حامل ہے۔

حواشی و حوالہ جات

* صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور۔

۱۔ فدا علی عیش، ''تاریخ طبع سابق لراقمہٗ''، مشمولہ دریاے تعشق از واجد علی شاہ (کان پور: نول کشور، ۱۸۸۵ء)، ص۲۴۔

۲۔ واجد علی شاہ، دریاے تعشق (کان پور: نول کشور، ۱۸۸۵ء)، ص۲۔

۳۔ ایضاً، ص۶۳۔

۴۔ ایضاً، ص۶۴۔

۵۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب، سلطانِ عالم واجد علی شاہ: ایک تاریخی مرقع (لکھنؤ: آل انڈیا میر اکاڈمی، ۱۹۷۷ء)، ص۲۰۴۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۰۵۔

۷۔ واجد علی شاہ، دریاے تعشق (لکھنؤ: شاہی مطبع، س ن)، ص۱۲-۱۳۔ بحوالہ مسعود حسن رضوی ادیب۔

۸۔ واجد علی شاہ، دریاے تعشق (نول کشور)، ص۴۔

۹۔ ایضاً، ص۴۔

۱۰۔ واجد علی شاہ، دریاے تعشق (لکھنؤ: شاہی مطبع، س ن)، ص۲۰۳۔ بحوالہ مسعود حسن رضوی ادیب۔

۱۱۔ واجد علی شاہ، دریاے تعشق، ص۴۔

۱۲۔ ایضاً، ص۶۳۔

۱۳۔ واجد علی شاہ، دریاے تعشق، دوسرا ایڈیشن (لکھنؤ: مطبع سلطانی، س ن)، ص۲۳۲-۲۳۳۔ بحوالہ مسعود حسن رضوی ادیب۔

۱۴۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب، سلطانِ عالم واجد علی شاہ: ایک تاریخی مرقع، ص۳۰۶۔

۱۵۔ *واجد علی شاہ*، پری خانہ، *مترجم تحسین سروری* (*لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء*)، *ص ۲۵*۔

۱۶۔ *سید مسعود حسن رضوی ادیب*، سلطانِ عالم واجد علی شاہ: ایک تاریخی مرقع، *ص ۲۲۰*۔

۱۷۔ *واجد علی شاہ*، دریاے تعشق، *ص ۸*۔

۱۸۔ *ایضاً، ص ۳۷*۔

۱۹۔ *عبدالحلیم شرر*، گذشتہ لکھنؤ، *مرتبہ شمیم انہونوی* (*لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۵ء*)، *ص ۶۹*۔

۲۰۔ *سید مسعود حسن رضوی ادیب*، سلطانِ عالم واجد علی شاہ: ایک تاریخی مرقع، *ص ۸۸*۔

۲۱۔ *کوکب قدر سجاد علی مرزا*، انتخاب واجد علی شاہ اختر (*لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، س ن*)، *ص ۳۱*۔

مآخذ

ادیب، سید مسعود حسن رضوی۔ سلطانِ عالم واجد علی شاہ: ایک تاریخی مرقع۔ *لکھنؤ: آل انڈیا میر اکاڈمی، ۱۹۷۷ء*۔

شاہ، واجد علی۔ پری خانہ۔ *مترجم تحسین سروری*۔ *لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء*۔

______۔ دریاے تعشق۔ *کان پور: نول کشور، ۱۸۸۵ء*۔

شرر، عبدالحلیم۔ گذشتہ لکھنؤ۔ *مرتبہ شمیم انہونوی*۔ *لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۵ء*۔

مرزا، کوکب قدر سجاد علی۔ انتخاب واجد علی شاہ اختر۔ *لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، س ن*۔